برصغیر میں مغلوں کا زوال اور علمائے کرام کی غلبہ حق کے لیے مساعی

The decline of the Mughals in Subcontinent and the Efforts of Muslims Scholars for the domination of Islam

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن*

ڈاکٹر حافظ عبدالرشید**

Abstract

Islam is Allah's favorite and safe religion till the Day of Judgment. The sign of this religion is that it can never be overcome, but it prevails over other religions. That is why, at any time or in any area, whenever an outsider became dominant on it, its followers continue their efforts to dominate this religion as per their capacity. In the era of British imperialism on Indian subcontinent, the Muslim scholars and intellectuals, in view of their Islamic pride, could not accept the dominancy other than Islam and continued their struggles to dominate the Islamic State. After the 'Alamgir's rule, in Indian subcontinent, the Muslim government and its domination continued to decline, and after 1857 its was abolished completely . During this period, Muslim intellectuals were constantly striving for domination. In this article, their efforts are presented in a unique way so that the coming Muslim generations will never be disappointed in any situation and as per Islamic nature, they should rely on Allah for the revival of Islam and its supremacy.

Keywords: British Imperialism, Mughal's Decline, Muslim scholars, Sub-continent.

برصغیر پاک وہند میں مسلمان بادشاہوں میں سے اورنگ زیب عالمگیر کا دور وسعت سلطنت اور انتظام مملکت کے لحاظ سے دورِ عروج جانا جاتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر ایک نیک، متقی، راسخ العقیدہ سنی بادشاہ تھا۔ اس نے مملکت میں اسلام نافذ کیا۔ عدل وانصاف کا محکمہ توکلی طور پر علماء کے سپرد تھا[1] اور وہ تمام معاملات کا فیصلہ قرآن وسنت کے مطابق کرتے تھے۔ عالمگیری دور میں قاضیوں کے اختیارات وسیع ہوتے تھے ۔ وہ اپنے علاقہ میں امن وامان قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ وہ رعایا کے مقدمات سنتے اور بیت المال کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ غریبوں کو کپڑے تقسیم کرنے کا کام بھی ان ہی کے سپرد ہوتا تھا۔ املاک کے تبادلوں اور تمسکوں اور بیع ناموں کی تصدیق بھی قاضیوں کے ذمہ ہوتی تھی،[2] یوں عام عوام کو اپنی معاشرتی اور سماجی زندگی اسلام کے اصولوں اور حکموں کے مطابق گذارنے میں کوئی مشکل نہیں تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر نے دو لاکھ روپے کی لاگت سے ۱۶۷۰ء میں شیخ نظام الدین برہان پوری کی راہنمائی میں علماء وقت سے فتاویٰ مرتب کروائے۔ جو فتاویٰ عالمگیری کے نام سے معروف ہوئے۔[3]

غیر مسلموں کے ساتھ بھی اورنگ زیب کا برتاؤ نہایت منصفانہ تھا۔ اس نے انہیں ان کے مذہبی معاملات میں آزادی دے رکھی تھی اور ان کے مذہبی پروگراموں پر حکومت جو رقم بطور محصول یا ٹیکس وصول کرتی تھی وہ عالمگیر نے معاف کر دی البتہ ان پر جزیہ عائد کر دیا۔ جزیہ کے لاگو ہونے سے اگرچہ ہندو اس کے مخالف ہو گئے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس طرح پچیس، تیس لاکھ روپے سالانہ کے محصول معاف

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد

**اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد

ہوئے جبکہ جزیہ سے جو آمدنی ہوئی وہ اتنی نہ تھی۔[4]

اورنگ زیب اوراس کے قبل کے یہ مسلمان بادشاہ ہر فرد کی مذہبی آزادی کا احترام کرتے تھے۔ پنڈت سندر لال اس بارے میں لکھتے ہیں۔

''اکبر، جہاگیر، شاہجہاں اوران کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لیے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانبداری نہ کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئیں تھیں۔ آج تک ہند کے متعدد مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کیے جانے کا تذکرہ ہے۔ اس قسم کے دو فرمان اب تک الہ آباد میں موجود ہیں جن میں سے ایک ارپل سومیشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے ۔''[5]

علاوہ ازیں ہندؤں کو منصب داریوں میں بھی شریک کیا جاتا تھا۔ عالمگیری عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا ہوئی، انہیں گورنر بنایا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے خالص اسلامی صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب سلطنت مقرر کیا تھا وہ ہندو راجپوت ہی تھا۔[6]

عالمگیر نے شراب بھنگ، جوا، زنا اور فاحشہ عورتوں کی خرید و فروخت قطعاً ممنوع قرار دے دی تھی۔ اور جو لوگ اس کا لحاظ نہ کرتے انہیں سخت سزا دی جاتیں۔[7] اس کے دور میں ملک اقتصادی طور پر بھی ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ احتساب کا محکمہ قائم کر کے لوٹ مار اور ناجائز نفع خوری کو روکا گیا لین دین میں باقاعدگی پیدا کی گئی۔ منڈیوں کی نگرانی کی گئی۔ محصولوں میں توازن پیدا کیا گیا اور حتی الوسع محصول معاف کر دیئے گئے۔ مال گذاری کی مناسب شرحیں مقرر ہوئیں۔ تجارت سے ناجائز محاصل اٹھا دیئے اور عام اور کھلی تجارت رائج کی۔[8]

صنعتی طور پر بھی مملکت عہد عالمگیر میں خوشحالی کی جانب گامزن تھی۔ آگرہ، اجمیر، بھکر، مالوہ، پٹنہ، ملتان، کشمیر، راج محل، گولکنڈا اور پنجاب کے دیگر اضلاع میں کپڑے کی تمام اقسام کے اور لوہے وغیرہ کے متعدد کارخانے تھے۔[9]

عہد عالمگیری میں سلطنت خداداد ایسے تمام اوصاف سے متصف تھی جو کسی سلطنت کی ترقی کی علامت سمجھے جاتے ہیں جیسے سیاسی استحکام، زرعی، اقتصادی اور معاشی اعتبار سے اور تعلیمی میدان میں خود کفیلی وغیرہ وغیرہ۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی سلطنت مغلیہ زوال کا شکار ہو گئی۔ اگرچہ بعد میں چند بادشاہوں کو ایسے زرین مواقع میسر آئے کہ اگر وہ اس وقت عقل و دانش سے کام لیتے اور حالاتِ حاضرہ سے فائدہ اٹھاتے تو دوبارہ سے اپنے خاندانی اقتدار کو مضبوط اور پائیدار بنا سکتے تھے۔ مگر عیش و عشرت اور آرام و راحت جیسی عادات جب سلاطین مغلیہ نے اپنالیں تو ذلت و رسوائی ان کا مقدر بنتی چلی گئی۔[10]

مرکزی حکومت جب کمزور ہوئی تو صوبوں میں امراء نے خود مختاری حاصل کی لی۔ اور ساتھ ہی ان امراء میں حصول نوابی کے لیے باہمی لڑائیوں اور چپقلشوں کا آغاز بھی ہو گیا۔ ریاست حیدر آباد، دکن اور کرناٹک میں جب تک نظام الملک آصف جاہ زندہ رہے امن و امان قائم رہا مگر ان کے وفات کے ساتھ ہی ان کے بیٹے ناصر جنگ اور نواب مظفر جنگ میں دکن کے تخت کے لیے ٹھن گئی لہٰذا دونوں نے اپنے مد مقابل کو نیچا دکھانے کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائے۔ اس موقع پر یورپ کی تجارتی کمپنیوں نے اپنے فوائد کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ بعد از جنگ

وہ فاتح امیر سے اپنی کمپنی کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر سکیں، اس لڑائی میں شرکت فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی نے مظفر جنگ کا ساتھ دیا جبکہ انگریزوں نے ناصر جنگ کا ساتھ دیا۔[11]

یورپی اقوام کی ہندوستان آمد ۱۴۹۸ء میں ایک پرتگالی جہاز ران واسکوڈے گاما کے ہندوستان پہنچنے سے شروع ہوئی۔ اہل پرتگال کی دیکھا دیکھی یورپ کی دیگر اقوام نے بھی ہندوستان کا رخ کیا۔ چنانچہ ولندیزی آئے اور انہوں نے پرتگالیوں کی تجارتی اجارہ داری ختم کی۔ پھر اہل ہالینڈ، اہل برطانیہ اور فرانسیسیوں نے بھی برصغیر کے ساتھ بحری تجارت شروع کی۔ یہ اقوام آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ چنانچہ انہی باہمی لڑائیوں میں رفتہ رفتہ اہل پرتگال ختم ہوگئے۔ جزائر مشرق الہند میں دلندیزیوں نے اپنی اجارہ داری اور نوآبادیاتی قائم کرلی اور برصغیر پاک وہند فرانسیسیوں اور انگریزوں کے لیے تجارتی مراکز بنے۔ جہاں بعد میں انگریزوں نے فرانسیسیوں کو ہندوستان تجارت سے نکال کر باہر کیا۔ پھر پورے برصغیر میں اپنی حکمرانی قائم کی۔

ان اقوام کا مطمع نظر اگرچہ بظاہر تجارت تھا مگر درپردہ انہوں نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ اپنا اقتدار اور تسلط قائم کریں۔ چنانچہ جہاں جب بھی انہیں موقع ملا انہوں نے اپنے ان پوشیدہ عزائم کے مطابق عمل کیا۔[12]

فرانسیسی اور انگریز ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ یورپ میں ان کے درمیان طویل خانہ جنگی جاری رہی۔ چنانچہ یہ اقوام برصغیر کی تجارت میں بھی ایک دوسرے کے مخالف ٹھہریں۔ ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ وہ دوسرے کی تجارت کو تباہ کر کے برصغیر پر خود اپنی تجارتی بالا دستی قائم کرے۔ اس ضمن میں شروع شروع میں فرانسیسیوں کو برتری حاصل ہوئی۔ انہوں نے انگریزوں کو اولاً مدراس سے بے دخل کر دیا مگر بعد ازاں صلح کی بنا پر وہ علاقے واپس انگریزوں کو دینے پڑے۔ پھر آصف جاہ کی وفات کے بعد جب نوابی کے لیے مظفر جنگ اور ناصر جنگ میں کشمکش ہوئی تو فرانسیسیوں نے ایک سازش کے ذریعے ناصر جنگ کو قتل کروا کے دکن اور کرناٹک میں چندر صاحب اور صلابت جنگ کو امیر بنوایا، یوں برصغیر میں فرانسیسی اقدار کی راہ ہموار کی۔[13] اس وقت انگریزوں کو اپنے بقا کی فکر لاحق ہوئی لہٰذا انہوں نے اپنی کوششوں کا آغاز کیا اور کچھ ہی عرصہ میں فرانسیسیوں کو ان علاقوں سے بے دخل کر کے اپنی مرضی کے امراء مقرر کروائے۔

ان لڑائیوں میں ان مغربی اقوام نے اپنی مٹھی بھر جمعیت کے ساتھ بڑی بڑی دیسی افواج کو شکستیں دیں بظاہر تو ان جنگوں میں ان کی بہادری عیاں ہوئی ہے مگر دراصل ان کی فتوحات ان سازشوں اور مکر وفریب کا نتیجہ ہوتیں، جو یہ امراء کے درمیان باہمی نفاق اور دشمنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کرتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں میر جعفر کی غداری کی بنا پر سراج الدولہ کو شکست دی۔[14]

انگریزوں کا عام طریقہ کار یہ تھا کہ وہ براہ راست حکومت نہ کرتے تھے بلکہ صوبوں میں امراء کے پاس اپنا ایک نمائندہ مقرر کرتے اور اس کی اجازت کے بغیر امیر ریاست یا صوبہ کوئی بڑا اقدام نہ کر سکتا تھا علاوہ ازیں وہ اہم محکمے جیسے دفاع اور دیوانی کا نظام اپنے تحت کر لیتے تھے۔ اس طرح جیسے جیسے انہیں موقع ملتا وہ مختلف صوبوں پر اپنا تسلط بڑھانے چلے جاتے اور جو کوئی امیر یا نواب ان کی نہ مانتا اور ان کے خلاف ہوتا تو وہ اس کیخلاف ہر ممکن کاروائی کرتے، دغا، فریب، دھوکہ دہی اور بدعہدی جیسے مکروہات بروئے کار لاتے ہوئے اسے ختم کرنے کی کوشش

کرتے۔اسی دوران میسور کے حیدر علی نے انگریزوں کے عزائم کو سمجھتے ہوئے ان کے خلاف آواز اٹھائی۔اس نے مرہٹوں اور نظام سے مل کر انگریزوں کے خلاف ایک اتحاد بھی قائم کیا جو انگریزوں نے رشوت و دھوکہ سے ختم کیا۔تاہم وہ آخری عمر تک ان سے لڑتا رہا اور اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان ٹیپو ان سے بر سر پیکار رہا۔ مگر آخر میں مرہٹہ، نظام اور انگریزوں کے متحدہ لشکر جب اس کے مقابلے میں آئے اور اس کے وزراء میر صادق وغیرہ نے غداری کی تو سلطان کو دبنے اور شکست قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نظر نہ آیا تو اس نے شیر کی طرح موت کو قبول کیا اور گیدڑ کی صد سالہ زندگی کو شیر کی ایک دن کی زندگی پر ترجیح دی۔ سلطان ٹیپو کی وفات کے بعد اب پورے ہندوستان کے راستے انگریزوں کے لیے صاف ہو گئے۔[15]

ادھر تحت دہلی کے حالات بھی نازک تھے۔ ۱۷۶۴ء میں شاہ عالم نے بکسر کی لڑائی میں ہزیمت اٹھانے کے اگلے سال ہی بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کے سپرد کر دی اور خود الہ آباد میں انگریزی پنشن خور بنا۔ پھر مادھوبی سندھیا نے شاہ عالم کو دعوت دی کہ وہ انگریزوں کی سرپرستی چھوڑ کر اس کی سرپرستی میں آجائے۔ چنانچہ اس طرح شام عالم دوبارہ دہلی کے تخت پر بیٹھا۔اسی دوران غلام قادر روہیلے نے شورش برپا کر کے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوادیں اور شاہی خاندان کی بیگمات کے ساتھ اچھا سلوک روا نہ رکھا۔ جب مادھوبی سندیا کو اس کا علم ہوا تو اس نے غلام قادر کا سر کاٹ پر بادشاہ کو پیش کیا اور اسے دوبارہ تحت دہلی پر بٹھایا۔ ۱۸۰۳ء تک جب تک مرہٹہ قوت میں رہے بادشاہ دہلی ان کے زیر نگیں رہا اور جب ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا تو بادشاہ بھی ان کے زیر نگیں آگیا اس کے بعد ۱۸۵۷ء تک مغلیہ حکمرانِ دہلی انگریزوں کے زیر سرپرستی رہے۔[16]

انگریزوں کا طرز حکومت و سیاست تجارتی بنیادوں پر مبنی تھا۔انہوں نے کبھی بھی کوئی ایسا اقدام نہیں کیا کہ ان کی تجارت پر حرف آئے۔ یہ ان کے لیے بہت پہلے ممکن تھا کہ وہ یکبارگی اقدام کر کے پورے ہندوستان کو سرنگوں کر لیتے مگر انہوں نے ہمیشہ ہندوستانی حکمرانوں کی آڑ لے کر حکومت کی۔ بظاہر امیر یا بادشاہ ہندوستانی ہی ہوتا تھا مگر اصل حکومت انگریزوں کی ہی ہوتی تھی چنانچہ جب دہلی بھی انگریزوں کے تحت آیا تو یہ مشہور ہو گیا کہ خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔[17]

ان حالات میں ہندوستان کے صاحب دانش اور حالاتِ حاضرہ سے واقفیت رکھنے والے باکمال علماء اپنے فرائض سے غافل نہ تھے۔ دور زوال میں علماء میں سے جس ہستی نے مجددانہ کردار کیا وہ حضرت شاہ ولی اللہ کی ذات بابرکات ہے۔ آپ نے جہاں تعلیمی میدان میں فلسفہ و کلام کی بجائے قرآن و حدیث کو رواج دیا اور مسلمانوں میں رسوم کافرانہ کی نشاندہی کرتے ہوئے معاشرتی اصلاح کے لیے کوششیں کیں وہاں مسلمانوں کی سیاسی طور پر گرتی ہوئی حالت کو بہتر بنانے کے لیے بھی اپنے تئیں کوشش کی۔ انہوں نے ''فک کل نظام'' کا نظریہ پیش کیا کہ تمام نظام ہائے باطل کو ختم کر کے صرف اور صرف اسلام کا نظام رائج کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ساری زندگی یہ کوشش جاری رکھی کہ مسلمانوں کا غلبہ ہو اور ظلم و جور اور بادشاہی نظام کی بجائے اسلام کا خلافتی نظام قائم کیا جائے۔[18]

علماء اسلام کا بالعموم اور برصغیر میں شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد اس سلسلہ ولی اللّٰہی سے متعلق علمائے کرام کی مساعی کا تاریخی لحاظ بغور جائزہ

لیا جائے تو کچھ یوں سمجھ آتا ہے کہ جب تک مسلم حکمران کی طاقت و حکومت قائم رہی تو علماء اس کوشش میں لگے رہے کہ مسلم حکمران طبقہ کی تربیت اسلامی نہج پر کی جائے تاکہ وہ نظام اسلامی کو نافذ کریں۔ اور اگر اس کی سیاسی یا فکری غلطی ظاہر ہو تو اس کی اصلاح کی جائے جیسا کہ مجدد الف ثانی اور ان کے خلفاء کا معمول رہا ہے اور اس طرح جب بعد میں مغلوں سے خیر کی توقع مفقود ہو گئی اور بظاہر یوں سمجھ آتا کہ کفار کا غلبہ ہو جائے گا یعنی سیاسی اور فوجی اعتبار سے سلطنت کا دم خم ختم ہوتا جا رہا تھا تب بھی علماء حق غافل نہ تھے۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے اپنی حیات میں تختِ دہلی پر جب مغلیہ حکومت کی کمزوری اور غیر مسلموں خصوصاً مرہٹوں کا عروج دیکھا تو اس کا فرانہ سیلاب کو روکنے کی سعی کی اور احمد شاہ کو خط لکھ کر ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔[19] اور مقامی افراد کو اس کی حمایت کی ترغیب دی۔ شاہ صاحب کا منشاء کسی خاندان کی حکومت کی حفاظت نہ تھی بلکہ صرف اور صرف اسلام کی حکمرانی کی حفاظت مطلوب تھی مگر احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کا زور توڑنے کے بعد واپس افغانستان چلا گیا اور تختِ دہلی پھر نااہل مغلوں کے سپرد ہوا۔

شاہ ولی اللہ کے بعد شاہ عبدالعزیز نے بھی یہی انداز اپنایا کہ جب تک انہیں کسی مسلمان امیر سے یہ امید وابستہ رہی کہ وہ کفار کی بڑھتی قوت کے سامنے بند باندھ سکتا ہے وہ عوام کو اس کا ساتھ دینے کی ترغیب دیتے رہے۔ غالباً اسی سلسلہ میں انہوں انے اپنے مرید و خلیفہ حضرت سید احمد شہید کو امیر علی خان سنبھلی کے پاس بھیجا۔[20] امیر علی خان اپنے دور کی سب سے بڑی آزاد قوت تھی۔ ایک موقع پر چالیس ہزار کا لشکر اور ایک سو پندرہ توپیں اس کے پاس تھیں۔ یہ جب تک آزاد رہا اور اس میں کفار سے نبرد آزما ہونے کی اخلاقی صلاحیت موجود رہی اور اس سے یہ امید باقی رہی کہ وہ اسلام کی بلندی و عروج کے لیے کچھ کر سکیں گے تب تک سید احمد شہید صاحب ان کے ساتھ رہے۔ مگر جب بعد میں حالات کی مصلحتوں کی بنا پر اس نے انگریزوں سے دب کر صلح کر لی تو سید صاحب اس سے الگ ہو گئے اور واپس دہلی اپنے استاد شاہ عبدالعزیز کے پاس حاضر ہو گئے۔[21]

اب جبکہ پورے ہندوستان میں کوئی ایک بھی ایسی قوت باقی نہ رہی جو اسلام اور مسلمانوں کو آزادی عطا کر سکتی تو علماء اسلام نے عوامی سطح پر جدوجہد کا آغاز کیا۔ چنانچہ مولانا شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ یہ فتویٰ فارسی زبان میں دیا گیا تھا جس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

"یہاں رؤسا نصاریٰ کا حکم بلا دغوغہ اور بے دھڑک جاری ہے اور ان کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ملک داری، انتظامات رعیت، خراج، باج، عشر و مالگزاری، اموال تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کا انتظامات، مقدمات کا تصفیہ، جرائم کی سزائوں وغیرہ (یعنی سول، فوج، پولیس، دیوانی، اور فوجداری معاملات، کسٹم اور ڈیوٹی وغیرہ) میں یہ لوگ بطور خود حاکم اور مختارِ مطلق ہیں، ہندوستانیوں کو ان کے بارے میں کوئی دخل نہیں۔ بے شک نمازِ جمعہ، عیدین، اذان، ذبیحہ گاؤ جیسے اسلام کے چند احکام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور حریت کی بنیاد ہے (یعنی ضمیر اور رائے کی آزادی اور شہری آزادی) وہ قطعاً بے حقیقت اور پامال ہے چنانچہ بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں، عوام کی شہری آزادی ختم ہو چکی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ کوئی مسلمان یا ہندو ان کے پاسپورٹ اور پرمٹ کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف و جوانب میں نہیں آ سکتا۔ عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی اجازت دینا بھی ملکی مفاد یا عوام کی شہری آزادی کی بنا پر

نہیں بلکہ خود اپنے نفع کی خاطر ہے۔اس کے بالمقابل خاص خاص ممتاز اور نمایاں حضرات مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتے۔دہلی سے کلکتہ تک انہیں کی عمل داری ہے۔بے شک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدر آباد، لکھنو، رام پور میں چونکہ وہاں کے فرمانرواؤں نے اطاعت قبول کرلی ہے براہ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے (مگر اس سے پورے ملک کے دارالحرب ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا)"[22]

شاہ عبدالعزیز کے اس فتویٰ کے بعد علمائے کرام کی کوششیں ایک نئی جہت پر شروع ہوئیں۔سید اسماعیل شہید اور سید احمد شہید نے پورے ملک میں دورہ کر کے مسلمانوں کو تیار کیا کہ وہ دارالحرب کو دارالاسلام بنانے کے لیے اٹھیں اور مغربی استعمار اور غلبہ کفار کو ختم کرنے کے لیے جہاد کا آغاز کریں۔

چنانچہ سید احمد شہید کی قیادت میں مجاہدین نے افغانستان اور ہندوستان کے درمیانی آزاد قبائلی علاقے کو اپنا مرکز بنا کر جہاد کا آغاز کیا۔آزاد قبائلی علاقہ مرکز اس لیے بنایا گیا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت تھی اور چونکہ مسنون جہاد مطلوب تھا نہ کہ بلوا وغیرہ، اور بھی کئی وجوہات تھیں جس بنا پر اس سرحدی علاقے کو مرکز جہاد بنایا گیا۔[23]

ان دنوں پنجاب کی سکھا شاہی عام مسلمانوں پر بہت ظلم کر رہی تھی۔لہٰذا سب سے پہلے سکھوں کے خلاف کاروائیاں ہوئیں۔شروع شروع میں بہت کامیابیاں ہوئیں مگر پھر اپنوں کی بغاوت کی بنا پر شکستیں ہوئی بالآخر بالاکوٹ معرکہ میں ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ بمطابق ۷ مئی ۱۸۳۱ء میں سید احمد اور سید اسماعیل نے جام شہادت نوش فرمایا۔[24] مگر ان کی شہادت کے بعد ان کی جماعت نے جہاد کے سلسلہ کو جاری رکھا۔اگرچہ وسائل، تعداد اور حالات کی موافقت نے کبھی ان کا اس طرح ساتھ نہ دیا کہ وہ اسلامی ریاست قائم کر سکتے۔[25] مگر انہوں نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کیے رکھی چنانچہ جہاد کی روح مسلمانوں میں طویل انگریزی اقتدار میں باقی رہی۔اس دور میں بنگال میں حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک۔[26] اور نثار علی عرف تیتو میر کی تحریک خاص انگریزی عملداری کے علاقوں میں شروع ہوئی۔یہ دونوں تحریکیں خالص اسلامی تحریکیں تھیں۔تیتو میر کی تحریک نے تو انگریزی اقتدار کے خاتمے اور مسلمانوں کے اقتدار کا اعلان بھی کر دیا تھا مگر بعد میں انگریزوں سے دوبدو جنگ میں ۱۹ نومبر ۱۸۳۱ کو تیتو میر اور ان کے معتقدین کو شکست ہوئی۔[27]

تیتو میر سید احمد شہید کو کلکتے میں ۲۲۔۱۸۲۱ء میں ملے اور آپ کے مرید ہو گئے۔[28] یوں کہا جا سکتا ہے کہ بنگال اور شمالی ہند کے مسلمانوں میں گہرے روحانی تعلقات استوار ہو گئے تھے۔یہ تحریکیں اگرچہ بظاہر ناکام ہوئیں مگر ان کے اثرات ایسے نہ تھے جو تحریک کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے۔ان تحریکوں نے نہ صرف مسلم معاشرہ میں سے ہندوانہ رسوم کا خاتمہ کیا بلکہ مقامی مسلمانوں کو ایک ایک نیا وقار، ایک نئی فکر اور عزتِ نفس عطا کی اور برصغیر کے تمام مسلمانوں میں ایک روحانی ہم آہنگی پیدا کی۔

ان تحریکوں سے جو لوگ وابستہ تھے ان کے پیش نظر کوئی دنیاوی منفعت نہ تھی وہ خلوص اور للہیت سے احیائے اسلام کی سرگرمیوں میں لگے ہوئے تھے۔یہی وجہ ہے کہ اگرچہ شمالی آزاد قبائل علاقہ جات میں سید احمد شہید اور مولانا محمد اسماعیلؒ کی شہادت سے جماعت کو ناقابل تلافی

نقصان پہنچا مگر ان کے بعد جماعت کی سرگرمیاں جاری رہیں اور جو علاقہ بھی ان کی دسترس میں رہا وہاں انہوں نے اپنے تئیں نظام اسلام رائج کیا اور سکھوں کے بعد انگریزوں کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر ہنٹر اپنی کتاب Our Indian Muslims میں لکھتا ہے:

''یہ تحریک کسی رہنما کی موت وحیات سے بالکل مستغنی ہو گئی تھی۔ خود سید صاحب کی وفات کو بھی ان کے پر جوش حامیوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے ایک مقدس ذریعہ بنالیا تھا''۔[29]

ظاہری ناکامی نے علمائے امت کے حوصلوں کو پست نہ کیا۔ انہوں نے ہر شکست کے بعد نئے عزم کے ساتھ مغربی استعمار کے مقابلے کے لیے نیا میدان تیار کیا۔ سید احمد شہید کی شہادت کے بعد ان کی جماعت نے آزاد سرحدی علاقے یاغستان کو ہی اپنا مستقر بنایا اور وہاں سے جہاد جاری رکھا۔ برصغیر پاک وہند میں اس جماعت کے بہت سے مراکز تھے۔ جہاں سے روپیہ اور افراد باقاعدہ مرکز جہاد میں پہنچتے رہتے۔ انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں تو اس جماعت نے اتنی قوت حاصل کر لی تھی کہ ان کے مقابل انگریز سرکار کو ایک باقاعدہ فوجی چھاؤنی قائم کرنا پڑی جہاں باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی اور بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔[30]

اس دوران ہندوستان کے اندر علمائے عظام کی جانب سے آزادی کی کوششیں مسلسل جاری تھیں۔ چنانچہ ایک طرف تو انہوں نے عوام الناس کو تیار کیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف جب بھی ان کو موقع ملے برسرپیکار ہو جائیں اور دوسری طرف ان ہندوستانیوں سے رابطے استوار کیے جو کہ انگریزی فوج میں ملازم تھے۔[31] بعد ازاں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جسے انگریز غدر کا نام دیتے ہیں، کے بظاہر اسباب، الحاق، لاخراجی زمینوں کی ضبطی، جیل خانوں میں ایک کھانا، فوجی بھرتی میں سمندر پار جانے کی شرط، گھی میں چربی اور آٹے میں ہڈیوں کی راکھ کا پروپیگنڈہ، چپاتیوں کی تقسیم اور چربی لگے ہوئے کارتوسوں کے افسانے اور ان کے اثرات، پیشین گوئیاں، شاہ ایران اور شاہ روم سے غلط توقعات وغیرہ وغیرہ تھے۔[32] مگر دراصل یہ ہندوستانیوں کے دلوں میں رفتہ رفتہ بڑھتے ہوئے اس احساس کا نتیجہ تھا کہ انگریزوں کی حکومت کے تحت وہ کبھی بھی مذہبی طور پر آزادی سے نہیں رہ سکتے۔ اور نہ ہی معاشی طور پر بہتر ہو سکتے ہیں کیونکہ انگریزوں کے آنے سے ہی ہندوستانی تجارت رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی، ہندوستانی صنعتیں تباہ ہوتی گئیں اور رفتہ رفتہ ہندوستان ایک زرعی ملک بنتا جارہا تھا۔ اب انگریز جو یہاں سے پہلے ہندوستانی صنعتی مال لے جایا کرتے تھے اب صرف خام مال لے جایا کرتے اور تیار شدہ مصنوعات ہندوستان لائی جاتیں۔ الغرض انگریزی چاپلوسی نے ہندوستان کو انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہی ایک زرعی ملک بنا دیا گیا تھا۔[33] یہ احساس انہیں علمائے وقت اور پڑھے لکھے باشعور افراد سے عطا ہوا تھا۔ چنانچہ حصول آزادی کے لیے انہوں نے ملک گیر جدوجہد کا آغاز کیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ایک اتفاقیہ جنگ نہ تھی بلکہ آزادی کی منظم کوشش تھی جس کے آغاز کے لیے ملک بھر میں ۳۱ مئی کی تاریخ طے ہوئی تھی مگر میرٹھ کی چھاؤنی میں اس کا آغاز ۱۰ مئی کو ہی ہو گیا۔[34] ناکامی کی وجوہات میں غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اگرچہ بظاہر قیادت بہادر شاہ ظفر، برجیس قدر و ممتاز محل (ملکہ اودھ) نواب خان بہادر خان (روہیل کھنڈ) نواب محمود خان (نجیب آباد) نواب تفضل حسین خان (فرخ آباد) وغیرہ تھے مگر تحریک کے اصل بانی اور اس کو آخری شکل دینے والے

علماء ومشائخ ہی تھے جن میں مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی، امام المجاہدین مولوی سرفراز علی گورکھپوری، مولانا لیاقت علی (الہ آبادی) اور عظیم اللہ کانپوری سرفہرست ہیں۔[35] علاوہ ازیں ہر مقام پر علمائے عظام نے اپنی استطاعت کے مطابق اس جنگ میں حصہ لیا تھا۔ چنانچہ دہلی میں شاہ عبدالغنی مجددی، شاہ حسن عسکری، شاہ ابوسعید مجددی، مولوی فرید الدین وغیرہ، لدھیانہ میں مولوی عبدالقادر، مولوی محمد، مولوی عبدالعزیز، وغیرہ تھانہ بھون، شاملی اور کیرانہ میں حاجی امداد اللہ تھانوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی وغیرہ۔ نجیب آباد میں مولوی محمد منیر علی، مولوی وہاج الدین، مولوی گلزار علی وغیرہ۔ بربل میں مفتی سید احمد، مفتی عنایت احمد، مولوی محمد اسماعیل، حکیم مولوی سعید اللہ، وغیرہ۔ بدایوں میں مولانا فیض احمد، شاہجہان پور میں مولوی محمد نظام وغیرہ وہ قابل ذکر حضرات ہیں جنہوں نے اس تحریک میں پورے جوش و خروش سے حصہ لیا اور بعد میں اس کے نتائج بھی بھگتے۔ چنانچہ بعد میں جب انگریزوں نے بزور طاقت اس تحریک آزادی کو کچل ڈالا تو غداروں کو سر عام جہاں بھی پھانسیاں اور جزائر انڈیان میں ملک بدر و قید کی جو سزائیں دیں ان میں ایک بڑی تعداد علمائے امت کی ہی تھی۔[36]

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں سے جو ظلم و زیادتی والا رویہ رکھا اسکی مثال ہندوستانی تاریخ میں اس سے قبل نہیں ملتی۔ چنانچہ زندہ جلانا، اور توپ سے اڑا دینا تو معمولی سزائیں تھی۔[37] مسلسل سزائیں اور ظلم وانتقام کا دور ایک عرصہ تک جاری رہا اگرچہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ برطانیہ نے باغیوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا تھا مگر اس کے بعد بھی ان کو برابر گرفتار کیا جاتا رہا۔[38] ان حالات میں ہندوستانیوں کے لیے اپنی جان بچانا ہی مشکل تھی چہ جائیکہ وہ کسی نئی تحریک کا آغاز کرتے۔ مگر انگریزوں کی عملداری سے باہر آزاد قبائلی علاقہ جات میں مجاہدین نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ۱۸۵۷ء میں جنرل سر سٹڈنی کوٹن کی قیادت میں انگریزی فوج یاغستان میں داخل ہوئی کہ مجاہدین کو ختم کرے جو مسلسل اس کی حکومت کے لیے خطرہ تھے مگر وہ صرف ان کے خالی جھونپڑوں کو ہی مسمار کر کے واپس آ گئے۔[39] پھر بعد میں ۱۸۶۲ء میں مجاہدین نے دوبارہ زور پکڑا اور انگریزوں کی سرحدی چوکیوں پر حملے کرنا شروع کر کے باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں انگریز فوج ایک بڑی جمعیت اور بھاری توپ خانہ کیساتھ قبائلی علاقہ میں داخل ہوئی۔ اگرچہ یہ فوج انگریزی مجاہدین کے مرکز مالکا کی آبادی کو تباہ کر کے واپس لوٹی مگر اس کو بھاری جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔[40] ان شکست خوردہ حالات میں بھی مجاہدین نے ہمت نہ ہاری اور ایک اور عملی کوشش انگریزوں کے خلاف کی۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء میں مجاہدین کا ایک اور دستہ مولانا عبداللہ صاحب کی زیر کمان صف آراء ہوا۔ چھ ماہ کشت وخون ہوتا رہا۔ اس کے بعد اگرچہ بظاہر مجاہدین دب گئے مگر انہوں نے اپنے تئیں اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ان جنگوں کے نتائج بیان کرتے ہوئے انگریز مورخ ہنٹر لکھتا ہے کہ:

''پنجاب گورنمنٹ نے مہم کے نتائج بیان کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ مہم ختم بھی ہو گئی اور ہم اس قابل نہ ہو سکے کہ ہندوستانی مجاہدین کو وہاں سے نکال باہر کریں یا ان کو اس بات پر آمادہ کر سکیں کہ وہ اطاعت قبول کر لیں اور ہندوستان میں اپنے گھروں کو واپس آ جائیں''۔[41]

مجاہدین کی شکست کی وجوہات کا اگر جائزہ لیا جائے تو صرف دو وجوہات بنیادی طور پر سامنے آئیں گی ایک قبائل یاغستان کی موقع بہ موقع

غداری اور ذرا سی مشکل پڑنے پر انگریزوں کے ساتھ ہو کر مجاہدین کے خلاف ہو جانا، دوسری وجہ دور جدید کے مہنگے سامان جنگ کی عدم دستیابی بھی تھی۔

مجاہدین کے اس مرکز کے لیے روپیہ اور آدمیوں کی امداد چونکہ ہندوستان سے ہی جاتی تھی چنانچہ انگریزوں نے ان جنگوں کے دوران اور اس کے بعد بھی ۱۸۷۳ء تک ہندوستان میں برابر پکڑ دھکڑ کا کام جاری رکھا تاکہ مجاہدین کی امداد بند ہو جائے مگر صد آفریں ہے ان حضرات پہ کہ ان تمام پیش بندیوں کے باوجود ان کو کسی نہ کسی صورت امداد پہنچاتے رہے۔[42] منشی محمد جعفر تھانیسیری ان گرفتاریوں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"آخر ۱۸۶۳ء سے دس برس تک برابر قیامت برپا رکھی۔ صدہا مسلمان مارے خوف کے گھر بار چھوڑ کر عرب وغیرہ ملکوں میں جا بسے۔ خود غرضوں، خوشامدیوں اور ذاتی عداوت رکھنے والوں نے خوب دل کے چاؤ نکالے۔ دس برس تک اخباروں میں سوائے اس قصہ اور اس بحث کے کوئی دوسری بات کم ہی ہوتی تھی"۔[43]

۱۸۵۷ء کے بعد پورے ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت بہت مضبوط ہو گئی تھی۔ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ بہت امتیازی درجے کا سلوک کیا جاتا تھا۔ حکومتی معاملات میں ہندوستانیوں کا کوئی حصہ نہ تھا تمام اعلیٰ پوسٹوں پر انگریز ہی اپائنٹ کیے جاتے تھے۔ عام ملازمتوں میں ہندوؤں کو مسلمانوں کی نسبت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی بلکہ بعض موقعوں پر تو یہ اعلان بھی کر دیا جاتا تھا کہ یہ ملازمتیں صرف ہندوؤں کے لیے خاص ہیں اس سے انگریز قوم دو فائدے اٹھاتی تھی کہ ایک تو مسلمان قوم جو جذبہ حریت فکر اور جذبہ جہاد سے مالا مال ہے اور جو کسی وقت بھی ان کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں، کو مفلس کر دیا جائے۔ اور دوسرا یہ کہ اس طرح دونوں قوموں، ہندوں اور مسلمانوں، کے درمیان نفرت واختلاف پیدا کر کے ان کے آپسی اتحاد کو توڑ دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں "لڑائو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر پورا پورا عمل ہوا۔ چنانچہ اسی بنا پر دونوں قوموں کے آپس میں تصادم اور بلوؤں کا آغاز ہوا۔

ان حالات میں مسلم اہل دانش جن کے خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ دو گروہوں یا دو مکتب فکر میں بٹ گئے ایک کا خیال یہ تھا کہ اب چونکہ انگریز پوری طرح ہندوستان پر قابض ہو چکے ہیں لہٰذا اب مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب ہونا چاہیے ان کے علوم حاصل کرنے کے بعد ان کے حکومتی محکمہ میں داخل ہو کر مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنا چاہیے نیز یہ کہ انگریز کے دلوں سے مسلمانوں کے خلاف جو غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں ان کو دور کیا جائے۔ سر سید اس مکتبہ فکر کے سرخیل تھے اور آپ کے بعد علی گڑھ اور پھر مسلم لیگ اسی ڈگر پر قائم رہی کہ انگریز کی وفاداری سے جو مراعات اور فوائد حاصل ہو سکیں ان پر قناعت کی جائے۔

مسلمانوں کے دوسرے مکتب فکر کے افراد نے کبھی بھی انگریزی غلبہ کو دل سے قبول نہ کیا بلکہ وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے۔ یہ افراد اگرچہ بظاہر مصالحت کی پالیسی پر کاربند ہو گئے مگر یہ موقع کی تلاش میں رہے اور اس انتظار میں رہے کہ کب ہندوستان سے انگریزوں کو بے دخل کرنے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ اندرونِ خانہ ایسے افراد تیار کرتے رہے جو وقت

آنے پر جدوجہد آزادی میں ان کے ساتھ کھڑے ہوں اور پوری صلاحیتیں اس کے لیے صرف کر ڈالیں۔ اس مکتب فکر کے امام مولانا قاسم نانوتوی کو تسلیم کر لینا چاہیے اور ان کے بعد ان کے شاگرد اور دیگر حضرات جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، اس ڈگر پر اپنی صلاحیتوں کو لگاتے رہے۔

اس موقع پر جمال الدین افغانی کی کوششوں کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا انہوں نے اتحاد عالم اسلامی کا نظریہ پیش کیا اور ملک ملک گھوم کر اپنے خیالات وافکار کی اشاعت کی۔ ان کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ اسلام کی عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کیا جائے۔ وہ ترکی میں خلیفہ المسلمین کے حضور پیش ہوئے اور اپنا مقصد بیان کیا۔ وہ ایران کے بادشاہ ناصر الدین شاہ اور مصر کے بادشاہ خدیو اسماعیل کے حضور بھی پیش ہوئے اور اپنا مدعا بیان کیا۔ ہر ایک نے ان کی تائید کی۔ انہوں نے مہدی سوڈانی اور شیخ محمد عبدہ جیسے شاگرد پیدا کیے۔ بعدازاں حکمرانوں نے ان کی تعلیمات کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنے اپنے ملک سے نکال دیا بالآخر ترکی پہنچے اور وہاں بھی آخری عمر میں شاہی قیدی بنا لیے گئے بالآخر سرطان کے مرض میں ۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو استنبول میں فوت ہوئے۔ [44]

علامہ افغانی کی کوششیں اگرچہ بظاہر ناکام ہی رہیں مگر اس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کو ایک نیا انداز فکر ملا اور اب حصول آزادی کے لیے انہوں نے بین الاقوامی طور کوششیں شروع کر دیں۔

بیسویں صدی کی ابتداء میں انگریزوں کے خلاف آزادی کے حصول میں سرگرم افراد میں چند ایسے حضرات بھی ملتے ہیں جو شروع میں انگریزی تعلیم حاصل کرتے رہے پھر انگریزی وظیفہ پر یورپ اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے وہاں جب یورپی عوام کے سلوک سے انہیں اپنی شدید اور ذلت آمیز غلامی کا احساس ہوا تو پھر انہوں نے اپنے تئیں اپنے وطن کی آزادی کے لیے کوششوں کا آغاز کیا۔ ان افراد میں سے ایک شخص مسمی ہر دیال بھی تھا۔ اس نے انگریزوں کی مخالفت میں ترکی اور جرمنی کی پشت پناہی حاصل کی۔ رسائل اور اخبارات کے ذریعے سے اپنے خیالات وعزائم کی اشاعت کی۔ مختلف جہازوں کے ذریعے سے ہندوستان میں رائفلیں اور سامانِ جنگ نیز نقد روپیہ پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ اس پارٹی کے مرکز امریکہ، فلپائن، ملایا، ہانگ کانگ، سنگاپور، چین، مصر، ترکی، افغانستان وغیرہ تمام ممالک میں تھے۔ [45] اس پارٹی کا مقصد ہندوستان میں بغاوت کر کے انگریزوں کا یہاں سے انخلاء تھا۔ تاہم بین الاقوامی سطح پر بھی انگریزوں کے مظالم وزیادتیوں کو مختلف زبانوں میں بذریعہ اشاعت پھیلا کر انگریزی ساکھ کو نقصان پہنچانے میں اس پارٹی کا کردار فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

نتائج

اس تمام صورت حال کے جائزہ کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب تک ہندوستانیوں کو بین الاقوامی برادری سے یہ توقع تھی کہ وہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں ان کی مدد کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، برصغیر کی سیاست تشدد پسند بنیاد پر ہی قائم رہی۔ دہشت انگیزی اور تشدد کے اصول پر ہی انقلاب کا لائحہ عمل مرتب کیا جاتا تھا۔ مگر جنگ عظیم اول میں جب برطانیہ کو فتح اور ترکیہ اور جرمنی کو شکست ہوئی تو اس کے اثرات ہندوستانی سیاست پر بہت گہرے پڑے۔

غلامی کے اس دور میں علمائے ہند اندرون ہند میں کبھی بھی آرام کی نیند نہ سوئے۔ وہ اپنے تئیں جہاد کی تیاریوں میں لگے رہے تاکہ جب بھی حالات ان کے لیے کوئی راہِ عمل متعین کرے، وہ حصول آزادی اور عظمت اسلام کے لیے میدان عمل میں اتر آئیں۔

حوالہ جات

1. منتخب اللباب، خافی خان، نظام الملک، ہاشم علی خان، مترجم: محمود احمد فاروقی، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۵ء، ۳/۱۹۹
2. اورنگ زیب، ندوی، رشید اختر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۳۹۵
3. (i) برصغیر پاک وہند کی سیاست میں علماء کا کردار، ایچ بی خان، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۴
   (ii) مآثر عالمگیری، محمد ساقی مستعد خان، مترجم: محمد فدا علی طالب، بک لینڈ کراچی، ۱۹۶۱ئ، ص ۳۵۷
4. اورنگ زیب، ص ۴۷۵
5. مسلمانوں کا روشن مستقبل، طفیل احمد منگلوری، علیگ، سید، حماد الکتبی، لاہور (س۔ن)، ص ۵۰
6. علمائے ہند کا شاندار ماضی، محمد میاں، سید، مکتبہ رشیدیہ، کراچی، (س۔ن)، ۵/۵۷۰۔۱۔۵۷۱
7. اورنگ زیب، ص ۴۱۷
8. اورنگ زیب عالمگیر، ۴۱۷
9. ایضاً، ص ۴۱۷۔۴۲۷
10. مثلاً محمد شاہ کو اپنے طویل دورِ حکومت میں ایسے کئی مواقع ملے جس سے وہ فائدہ اٹھاتا تو سلطنت کے لیے سود مند ہوتا مگر خوشامدیوں کی باتوں میں آکر اس نے قابل اور خیر خواہ حضرات مثلاً آصف جاہ وغیرہ کو درباری معاملات سے الگ کر دیا اور اس کو کام کرنے کا موقع نہ دیا۔ اسی طرح بعد میں جب احمد شاہ ابدالی پانی پت میں مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد واپس جاتے ہوئے شاہ عالم ثانی کو ہی دہلی کا تخت سونپ گیا تھا تو اس وقت بنگال، اودھ اور روہیل کھنڈ کے سربلند حاکم اس کے سامنے اپنی اطاعت کا اظہار کر رہے تھے مگر شاہ عالم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ تاریخ پاکستان وبھارت، سید ہاشمی فرید آبادی، ادارہ معارف اسلامی، لاہور ۱۹۹۰ء، ۲/۶۸۔۱۰۱
11. کمپنی کی حکومت، باری علیگ، نیا ادارہ سرکلر روڈ لاہور، ۱۹۶۹ء ص ۸۰
12. History of British India, P.E.Roberts, Oxford University Press, London, 1955, P-15
13. do, P- 107
14. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ثروت صولت، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۳۷۱۔۳۷۲
15. تاریخ ٹیپو سلطان، محب الحسن، مترجم: حامد اللہ افسیر، بک ٹاک لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۴۳۲
16. تاریخ مسلمانانِ پاک وہند، ۲/۱۰۱۔۱۰۳
17. علمائے ہند کا شاندار ماضی، ۲/۷۸
18. شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، سندھی، مولانا عبید اللہ، مرتب: پروفیسر محمد سرور، المحمود اکیڈمی، لاہور، (س۔ن)، ص ۱۹۔۲۰
19. تاریخ دعوت وعزیمت، ندوی، ابوالحسن علی، سید، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی، (س۔ن) ، ۵/۳۱۳
20. علماء ہند کا شاندار ماضی، ۲/۸۳

21. سید احمد شہید، مہر، غلام رسول، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، (س۔ن) ، ص ۹۳
22. فتاویٰ عزیزی (فارسی) ، ۱/۱۷، مطبوعہ مطبع مجتبائی، بحوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی، ۲/۷۹۔۸۰
23. سید احمد شہید، ص ۲۶۴۔۲۶۷
24. تاریخ دعوت و عزیمت، ۶/۴۲۴
25. تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ سر گزشت مجاہدین، مہر، غلام رسول، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، (س۔ن)
26. Fraidi Movement, Moinuddin Ahmad Khan, Pakistan Historical Society Karachi,1965, P- lxi
27. Ulema in Politics, Ishtiaq Hussain Qureshi, Maaref Limited,Karachi, 1974, P- 181
28. Fraidi Movement, P- lxi
29. ہمارے ہندوستانی مسلمان، ہنٹر، ڈبلیو ڈبلیو، مترجم: ڈاکٹر صادق حسین، مکی دار الکتب، لاہور، ۱۹۹۷ئ، ص ۲۳
30. ایضاً، ص ۲۹
31. ہنٹر کے نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط و کتاب کے جرم میں سزایاب ہوئے تھے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۲۴)
32. علمائے ہند کا شاندار ماضی، ۴/۷۵
33. نقشِ حیات، مدنی، سید حسین احمد، دار الاشاعت کراچی، س۔ن، ۲۸۸/
34. ۱۸۵۷ء، خورشید رضوی، ساگر پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹۴
35. ان حضرات کے تفصیلی کارناموں کے لیے ملاحظہ ہو۔ ۱۸۵۷ئ، ص ۱۵۶۔۳۶۵
36. ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں ناکامی کے بعد انگریزوں نے جو ظلم ہندوستانیوں سے روا رکھا تھا وہ ایک مہذب کہلانے والی قوم سے امید نہیں کیا جا سکتا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی، ۴/۲۱۹۔۴۲۷
37. انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ، تھامسن ایڈورڈ، مترجم: حسام الدین، گوتم پبلشرز لاہور، ۱۹۹۳ء ص ۳۵۔۵۷
38. ۱۸۵۷ء، ص ۳۷۶
39. علمائے ہند کا شاندار ماضی، ۳/۲۸۔۶۹
40. ایضاً، ۳/۷۸۔۹۰
41. ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۴۰
42. سر گزشت مجاہدین، ص ۵۹۳
43. تواریخ عجیب، بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی، ۳/۸۹
44. سید جمال الدین افغانی، رزاقی، شاہد حسین، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۴
45. علمائے ہند کا شاندار ماضی، ۵/۱۱۳